برصغیر میں اسلامی تاریخ نویسی کا آغاز وارتقاء

زیبا افتخار ☆

برصغیر میں مسلمانوں کی آمد نے جہاں اس سرزمین پر بڑے بڑے احسانات کئے وہیں ان کی تاریخ کو مدون کرنے اور آئندہ زندگی کے لئے محفوظ کر لینے کا احسان بھی کیا۔ سرزمین ہندوستان فن تاریخ نویسی سے ناواقف تھی۔ قدیم ہند کی تاریخ کے ماخذ محض ویو مالائی داستانیں، مذہبی قصے کہانیاں، یا کتبے تھے۔ یہ ماخذ قابل اعتبار نہ تھے اور ان سے حالات وواقعات کی صحیح تصویر کشی نہیں کی جاسکتی تھی، چنانچہ قدیم ہند کی تاریخ وقت کے دھندلکوں میں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ اس سرزمین پر تاریخ نویسی کے قابل ذکر دور کا آغاز ہوا اور بعض اہم تاریخی تصانیف وجود میں آئیں۔ پروفیسر ڈوڈویل اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''اسلام کی آمد کے بعد ہندوستان میں ایسی مسلم تاریخیں وجود میں آئیں جو خود ہماری قرون وسطیٰ کی (یورپین) تواریخ سے بدرجہا اعلیٰ مرتبہ کی حامل ہیں۔ یہ تاریخیں (ہماری ان تاریخوں کی طرح) خانقاہوں اور گرجوں کے راہبوں نے نہیں لکھیں، بلکہ ان لوگوں نے لکھی تھیں جو بذات خود حکومت کے کاموں میں شریک تھے۔ اور اکثر و بیشتر (ان حالات کے) معاصر تھے انہوں نے ان واقعات کو بچشم خود دیکھا تھا یا بذات خود ان مہمات میں شریک تھے..... ہندوستان کی تاریخ کا مسلم دور جیتی جاگتی شخصیات کا مرقع پیش کرتا ہے جبکہ ہندو دور میں ہمیں صرف سائے نظر آتے ہیں۔''[۱]

یہ سب دراصل مسلمانوں کی علم تاریخ میں غیر معمولی دلچسپی کا نتیجہ تھا، جو کہ ان کے مذہب کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ اس کا تذکرہ کیا جاچکا ہے کہ ابتداً تاریخ نویسی خالص مذہبی جذبات کا نتیجہ تھی، جس کہ وجہ سے مسلمانوں نے اسلام کی تعلیمات کو محفوظ رکھنے کے لئے علم الحدیث، مغازی وسیر، آثار واقوال صحابہ اور علم اسماء الرجال کو نشو ونما دی اور ان علوم پر بڑی تحقیق اور جستجو کے

☆ ڈاکٹر زیبا افتخار، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی۔

بعد گراں قدر تصانیف مرتب کیں۔ آہستہ آہستہ وقت اور حالات کے تحت اس کے مزاج میں تبدیلی آتی گئی اور پہلی صدی ہجری/ آٹھویں صدی عیسوی میں جب ہندوستان پر مسلمانوں کے حملے شروع ہوئے تو اس سے پہلے ہی دین و مذہب کے علاوہ دیگر اور کئی عوامل بھی مسلم تاریخ نویسی میں دلچسپی کا باعث بن گئے تھے، مثلاً وہ اپنے جنگی کارناموں، اور فتوحات کی داستانوں کو فخر سے سناتے اور ان کو محفوظ رکھتے تھے اس کے علاوہ آخر دورِ خلافت عباسی میں جو عجمی سلاطین برسر اقتدار آئے انھوں نے بھی ایسی تاریخیں لکھنے کی حوصلہ افزائی کی جن میں ان کی سطوت اور عظمت کا ذکر ہو، ان کی جنگی فتوحات کا بیان ہو اور ان کی خدا ترسی، نیک کاموں اور علمی سرپرستی کے کارناموں کا تذکرہ ہو۔[۲] نیز یہ سلاطین جس طرح سیرت نبوی ﷺ اور سوانح صحابہؓ سننے میں دلچسپی لیتے تھے، اسی طرح قدیم ایران و ترکستان کی تاریخیں اور وہاں کے بادشاہوں کے تذکرے بھی ذوق وشوق سے سنتے تھے۔ تاکہ ان کے تجربات اور واقعات سے سبق لیں اور ان پر فخر کریں۔[۳] مذہب سے ہٹ کر یہ وہ عوامل تھے جنھوں نے تاریخ کا دامن وسیع کیا اور انہی وجوہات کی بناء پر مورخین کو مسلم معاشرے میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہونے لگی، بادشاہوں کی سرپرستی نے ان کی قدر و منزلت اور بڑھادی اور یوں شعراء کی طرح اب مورخ کا دربار میں موجود رہنا ایک روایت بن گیا۔[۴]

برصغیر میں مسلم دور کے اوائل میں جو تاریخیں لکھی گئیں ان کی زبان عربی تھی اور جو کتابیں فارسی میں تحریر ہوئیں ان میں بھی عربی فن تاریخ نویسی کی روایت کو ملحوظ رکھا گیا۔[۵] مثلاً ابو ریحان البیرونی (متوفی ۴۴۰ھ/ ۱۰۴۸ء)[۶] نے ہندوستان میں رہ کر یہاں کے مذاہب، رسوم و رواج، علوم و فنون اور جغرافیائی حالات وغیرہ سے آگاہی حاصل کی اور پھر ان تمام معلومات کو اپنی کتاب تحقیق ما للهند[۷] میں عربی زبان میں پیش کیا۔ اسی کے ہم عصر ابو نصر محمد العتبی (متوفی ۴۲۷ھ/ ۱۰۳۶ء)[۸] کی تصنیف تاریخ یمنی[۹] بھی عربی زبان میں ہے جس میں اس نے سبکتگین کے پورے دور کی تاریخ قلمبند کی ہے اور سلطان محمود غزنوی کے حالات (۴۱۰ھ/ ۲۰-۱۰۱۹ء) تک بیان کئے ہیں، یہ کتاب کئی لحاظ سے کمزور ہے۔ مثلاً ابو نصر کی جغرافیائی حالات سے ناواقفیت کتاب کے بیان کو کمزور کرتی ہے، اسی طرح تاریخیں اور سنین کی طرف توجہ نظر نہیں آتی۔ ایک تو سنہ بہت کم بیان کئے گئے ہیں اور جو بیان کئے گئے ہیں ان میں غلطیاں ڈھونڈی جاسکتی ہیں۔ تاہم پھر بھی اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ فارسی زبان میں اس کے کئی ترجمے ہوئے اور کئی شرحیں لکھی گئیں۔ اسی عربی طرز روایت کی دوسری مثال ابو الفضل محمد بن الحسین بیہقی (متوفی ۴۷۰ھ/ ۱۰۷۷ء)[۱۰] کی مشہور زمانہ کتاب تاریخ بیہقی کی دی جاسکتی ہے۔ فارسی زبان میں یہ تصنیف اس نے دربار غزنی میں آل سبکتگین کی سرپرستی میں لکھی تھی۔ جو آل سبکتگین ہی کی تاریخ پر مشتمل ہے۔

جب مسلمان سلاطین کا مرکز غزنہ سے لاہور منتقل ہوا تو حیرت انگیز طور پر وہاں بھی فارسی زبان چھا گئی، بلکہ اس دور کے مورخین نے غزنہ کی فن تاریخ نویسی کی اس روایت کو بھی خیر باد کہہ دیا جو عربی کا خاصہ تھی اور جس میں تنقید رجال اور استناد کا خیال رکھا جاتا تھا۔ اب انہوں نے راویوں کا حوالہ دینے یا ان پر تنقید کرنے کا طریقہ ترک کر دیا البتہ دیگر خصوصیات کے لحاظ سے اس دور کی تاریخیں ماقبل کی تاریخوں کے مطابق رہیں۔ ان تاریخی تصانیف کو چار اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

☆ **عالمی تاریخ:** ایسی تاریخیں ہمہ گیر ہوتی ہیں۔ عموماً ابتدائے آفرینش سے لے کر اپنے عہد تک، اسلامی دنیا کے جائزے

پر مشتمل ہوتی ہیں۔

☆ **مناقب یا فضائل کے طرز کی تواریخ:** ایسی تاریخ کسی حاکم یا سلطان یا کسی اور مشہور شخصیت کی قصیدہ گوئی یا تعریف پر مشتمل ہوتی ہے۔

☆ **ناصحانہ طرز کی تاریخ:** یہ نصیحت آموز تاریخیں ہیں، جن میں گذشتہ واقعات کی مثالیں دے کر اپنے عہد کے بادشاہوں اور سلاطین وامراء کو اصول جہاں بانی اور آداب زندگی کی تلقین کی جاتی ہے۔

☆ **فن کارانہ اور شاعرانہ تاریخ:** نام ہی سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اس میں شعر وادب کی گل کاریاں ہوتی ہیں۔[۱۱]

فخر مدبر مبارک شاہ (متوفی ۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء) کی تاریخ **شجرہ الانساب مبارک شاہی** میں یہ چاروں اقسام بیک وقت پائی جاتی ہیں۔[۱۲] گویا یہ کتاب اُس زمانے کی اسلامی تاریخ نویسی کا مکمل نمونہ اور ان کی تمام خصوصیات کی آئینہ دار تھی مگر عربی تاریخ نویسی کا اصول تنقید روایت اور جرح و تعدیل اس میں مفقود تھی۔ فخر مدبر کے ہم عصر نور الدین محمد عوفی (متوفی ۶۳۰ھ/۱۲۳۲ء)[۱۳] کی تصنیف **جوامع الحکایات و لامع الروایات**[۱۴] ہے، جو انبیاء واولیاء اور ملوک وامراء کے واقعات اور حکایات کا مجموعہ ہے اور اس میں ایسے واقعات ملتے ہیں جو حقیقت پر مبنی ہیں اگر چہ اس میں زیب داستاں کے لئے اضافے بھی ہیں، ایسی تصانیف تاریخ سے زیادہ ادب کا شاہکار پیش کرتی ہیں اور ایسی کتابیں مورخین کے کسی کام کی نہیں رہتیں۔ پھر تقریباً نصف صدی کے بعد منہاج السراج جوزجانی[۱۵] (متوفی ۶۷۳ھ ۵-۱۲۷۴ء) کی عالمگیر تاریخ طبقات ناصری سامنے آئی جو اس نے سلطان ناصر الدین محمود کے عہد (۶۵۸ھ/ ۱۲۶۰ء) میں مکمل کی۔ یہ ایک مکمل عالمگیر تاریخ تھی جو تاریخ انبیاء بنی اسرائیل سے لے کر اپنے عہد یعنی سلطان ناصر الدین محمود کے عہد تک مشتمل تھی۔

اس موقع پر امیر خسرو[۱۶] کی تاریخی مثنویوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، گو کہ اس پر اعتراض یہ اٹھایا جاتا ہے کہ مثنویاں چونکہ شاعرانہ حسن کی ضروریات کو اولیت دیتی ہیں اس لئے ان میں بہت سے حقائق و واقعات دھندلے پڑ جاتے ہیں۔ لیکن یہ حکم سب پر نہیں لگایا جا سکتا۔ امیر خسرو کی تاریخی مثنویاں تاریخ کا ایک بڑا اور مستند ذریعہ ہیں اور بلاشبہ بہترین تاریخی ماخذ کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ مثنویاں تعداد میں پانچ ہیں۔

۱۔ قران السعدین ۲۔ مفتاح الفتوح ۳۔ عشیقہ ۴۔ نہ سپہر ۵۔ تغلق نامہ

جبکہ نثر میں ان کی تصنیف **خزائن الفتوح** ہے۔

سلطان بلبن کی وفات کے بعد اس کا پوتا معز الدین کیقباد ۶۸۵ھ میں دہلی کے تخت کا وارث ہوا، تو امیر خسرو کو ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کی وجہ سے اپنے دربار سے وابستہ کر لیا، اور پھر اسی کی فرمائش پر امیر خسرو نے اپنی پہلی تاریخی مثنوی **قران السعدین** ۶۸۸ھ میں تحریر کی، پھر سلطان بدلتے رہے مگر امیر خسرو کی اہمیت دربار میں کم نہ ہوئی۔ مثلاً کیقباد کے بعد جلال الدین فیروز خلجی حکمران ہوا تو صرف دو سال کے بعد یعنی ۶۹۰ھ میں دوسری مثنوی **مفتاح الفتوح** لکھی جس میں فیروز شاہ خلجی کی فتوحات کا ذکر ہے۔ پھر علاء الدین خلجی حکمران ہوا تو اس کی فرمائش پر مشہور نثری تصنیف **خزائن الفتوح** تحریر کی جو ۷۱۱ھ میں

مکمل ہوئی یہ عہد علائی کی مختصر مگر جامع تحریر ہے۔ چوتھی مشہور مثنوی، علاء الدین کے بیٹے اور ولی عہد سلطنت شہزادہ خضر خان کی فرمائش پر ۷۱۵ھ میں لکھی جس کا نام عشیقہ تھا، اس میں خضر خان اور اس کی چہیتی رانی، دیول دیوی، کی داستان محبت کا بیان ہے۔ ۱۷ (اسی مناسبت سے اسے مثنوی خضر خان و دول رانی بھی کہتے ہیں) قطب الدین مبارک خلجی کے سلطان بننے پر (۷۱۸ھ/ ۱۳۱۸ء) اس کے حکم سے نہ سپہر تصنیف کی جس میں اس کے ابتدائی عہد کے واقعات شامل ہیں۔ اس کے بعد خلجی خاندان کو زوال ہوا اور تغلق برسر اقتدار آئے امیر خسرو ان کے دربار سے بھی وابستہ رہے اور اسی زمانے میں انہوں نے اپنی آخری تصنیف تغلق نامہ (۷۲۵ھ/۱۳۵۲ء) لکھی۔ امیر خسرو کی یہ تمام تصانیف، مختلف سلاطین کی فرمائش پر ان کے ادوار میں لکھی گئیں۔ ۱۸ سرکاری سرپرستی اور سلطان کی ذاتی خواہش اور فرمائش پر لکھی جانے والی یہ تاریخی تصانیف عموماً انہی کے کارناموں پر مشتمل ہوتی تھیں، مگر تاریخی حقائق و وقائع کے لحاظ سے بہرحال مستند تھیں۔

تاریخ نویسی سے دلچسپی میں ایک موڑ اس وقت آیا جب ہندوستان میں عہد مغلیہ کا آغاز ہوا، اس عہد کی ابتدا میں ہم ہندوستان میں تین مختلف ادبی دھاروں کا اتصال پاتے ہیں، ان میں ایک تو ہندی فارسی روایت کا دھارا تھا۔ دوسرا دبستان ھرات کی روایت کا دھارا اور تیسرا نئی طرزوں کا دھارا تھا جنھیں خود سلاطین مغول نے جاری کیا تھا، ان تینوں کے اتصال سے ایک امتیازی ہندی تاریخی روایت قائم ہوگئی، گو ممکن ہے کہ بعض مصنفین ان تاریخوں سے بھی متاثر ہوئے ہوں جو ان کے معاصرین ایران میں لکھ رہے تھے۔ سلاطین کی تاریخ میں دلچسپی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ اب انہوں نے خود، اور شاہی خاندان کے افراد نے تاریخی کتب اور سوانح حیات لکھنا شروع کیں اور یوں بڑی بڑی شاہکار تاریخی تصانیف مرتب ہوئیں۔ ان میں سب سے ابتدائی مثال توزک بابری ہے جو ترکی زباں میں لکھی گئی اور یہ عہد مغلیہ کے بانی ظہیر الدین بابر کی خودنوشت سوانح ہے۔ جبکہ بابر کے عم زاد بھائی مرزا حیدر دوغلات (متوفی ۹۰۸ھ/ ۱۵۵۱ء) نے اپنی توزک تاریخ راشدی فارسی زبان میں لکھی، ۱۹ اسی طرح گلبدن بیگم ۲۰ نے اپنی سرگزشت ھمایوں نامہ کے عنوان سے لکھی۔ اس نے یہ سرگزشت اکبر کی درخواست پر لکھی تھی تاکہ اس کے معتمد ابوالفضل کو اپنی تاریخ کے لئے مواد مل سکے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے بہت گرانقدر ہے کہ اس میں شہنشاہ بابر اور ہمایوں کی گھریلو زندگی کی تفصیلات، مصنفہ کی ایک دلآویز تصویر اور ہمایوں کے زمانے کی درباری زندگی کا بیان شامل ہے۔ ۲۱ یہ سوانح ھمایوں نامہ کے نام سے منظر عام پر آئی، یہ اسلامی تاریخ کی ان چند کتابوں میں سے ایک ہے، جو درونی اور ذاتی نقطہ نظر سے لکھی گئی ہیں۔ جہانگیر نے اپنے عہد کے پہلے سترہ سال کی تاریخ توزک جھانگیری کے نام سے خود لکھی۔ صرف شاہی خاندان کے افراد نے ہی اس قسم کی تزکات نہیں لکھیں بلکہ بہت سے غیر سرکاری لوگوں نے بھی اس قسم کی سرگزشتیں لکھیں جن میں سادہ زبان اور بے تکلف انداز سے ایسے واقعات کا تذکرہ کیا ہے جو ان کے چشم دید تھے۔

ان مساعی کے ساتھ ساتھ مختلف عہد کے بادشاہوں کے عہد کی انفرادی تاریخیں بھی سرکاری طور پر قلمبند ہوتی رہیں ان میں ایک بڑا نام ابوالفضل علامی ۲۲ کا ہے جنھوں نے اکبر نامہ اور آئین اکبری لکھیں۔ اول الذکر یعنی اکبر نامہ ابوالفضل کی سب سے اہم تصنیف ہے جو کہ اکبر کے بزرگوں کی مختصر اور عہد اکبری کی مبسوط تاریخ ہے۔ آئین اکبری میں سلطنت کے نظم

ونسق اور اعداد و شمار کا ذکر ہے۔۲۳

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اکبر کے دور میں مقامی اور علاقائی تاریخ نویسی کی سرکاری سطح پر بڑی حوصلہ افزائی کی گئی۔ P.Hardy کے مطابق:

''اکبر نے مقامی اور علاقائی تاریخ نویسی کی اس لئے حوصلہ افزائی کی تھی کہ اس کی حکمرانی کی کڑیاں مغلوں سے قبل مسلم سلاطینِ ہندوستان کی تاریخ سے ملائی جاسکیں اور اس طرح ایک نفسیاتی اثر یہ پیدا کیا جائے کہ اس کی حکومت اسلامی حکومت کے تسلسل کا درجہ رکھتی ہے۔ان میں عباس خان شیروانی کی تحفۂ اکبر شاھی (مولفہ ۱۵۷۹ء) اور ابوالفضل کا اکبر نامہ شامل ہیں۔اس کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ نوزائیدہ مغل سلطنت کے شایان شان ایک عام اور مفصل علاقائی تاریخ لکھوائی جائے،اس کی مثال نظام الدین احمد کی طبقات الکبریٰ (مولفہ ۱۵۹۳ء) ہے۔''۲۴

اسی طرح شاہ جہاں کے دور کے واقعات، اورنگزیب کے عہد کے حالات بھی قلمبند کئے گئے ہیں، مغلیہ خاندان کے زوال اور انگریزوں کے عروج کی تاریخ غلام حسین خان نے لکھی۔مختصراً یہ کہ ہر خود مختار یا نیم خود مختار خاندان شاہی اور بنگال سے لے کر کرناٹک تک ہندوستان کے ہر صوبے سے متعلق اسی قسم کی تاریخوں کا سلسلہ موجود ہے اور گو وہ تاریخیں زیادہ مفصل نہیں تاہم بحیثیت مجموعی مفصل تاریخ نویسی کی خصوصیات کی حامل ہیں۔اس موقع پر عبدالقادر بدایونی ۲۵ اور محمد قاسم فرشتہ ۲۶ کے نام کے بغیر تذکرہ مکمل نہیں ہوسکتا۔عبدالقادر بدایونی کی کتاب منتخب التواریخ خاص طور سے قابل ذکر ہے، یہ ایک غیر سرکاری تصنیف ہے اور اس میں مشاہیر ہند کی تراجم نگاری اور سیاسی وقائع نویسی دونوں چیزیں موجود ہیں۔اس تصنیف کا مخصوص پہلو یہ ہے کہ اس میں اکبر کی دینی سرگرمیوں پر نہایت کڑی اور مخالفانہ نکتہ چینی کی گئی ہے۔یہ بھی خیال ہے کہ اس کتاب کو کم از کم عہد جہانگیری کے دسویں سال تک مخفی رکھا گیا۔۲۷ اس کے جانشین محمد قاسم فرشتہ نے ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے میدان کو وسیع تر کردیا۔تاریخ فرشتہ اس کی بڑی مستند اور مشہور تصنیف ہے۔یہ ایک سنہ وار تاریخ ہے جو تمام تر قدیم تواریخ، زبانی روایات اور خود فرشتہ کے ذاتی مشاہدات پر مبنی ہے۔اس کا مقصد مسلمانوں کے شاندار دور حکومت کی روداد نگاری ہے، جہاں تک تاریخی مواد سے استفادے کا تعلق ہے، فرشتہ کسی خاص اصول پر پابند نہیں۔یہی وجہ ہے کہ بیشتر ناقدین اس کی تاریخ نویسی پر تنقید کرتے ہیں اور اس کا ایک ناقد P. Hardy، کہتا ہے کہ:

''اب وقت آگیا ہے کہ اس کے کردار اور اس کی تاریخ نویسی کا از سر نو جائزہ لیا جائے۔''۲۸

برصغیر میں اسلامی تاریخ نویسی کا بیان یہاں ختم نہیں ہوتا بلکہ یہاں کی فضا میں نشو ونما پانے والی نئی زبان میں بھی تاریخی مذاق پیدا ہونے لگا تھا یہ نئی زبان جو آگے چل کر اردو کہلائی بہت سے ارتقائی مراحل سے گزرتی ہوئی عوام میں مقبول ہوتی چلی گئی ابتداً اسے ''ہندوی'' کے نام سے پکارا گیا۲۹ یہ خالص عوام کی بولی تھی اور کھڑی بولی کہلاتی تھی۔

جب دہلی میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی اور سلطنت کو استحکام اور استقلال حاصل ہوا تو یہی بولی تھی جو وہاں رائج تھی، جبکہ مسلمانوں کی مذہبی اور علمی زبان عربی تھی۔جس کا بول چال سے کوئی تعلق نہ تھا۔بلکہ ان کا تعلق ترکی امراء اور شاہی

خاندانوں ہی سے رہا، دفتری، کاروباری، درباری، تہذیبی اور تعلیمی زبان فارسی تھی، فارسی اور ہندوی کے ملاپ سے ایک نئی مخلوط بولی وجود میں آئی جس کو امتیاز کے لئے ''ریختہ'' ۳۰ کا نام دیا گیا۔ جس سے مراد ملی جلی زبان ہے۔ ابتداء میں لفظ ریختہ صرف منظوم کلام کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ بعد میں عام زبان کے لئے استعمال ہونے لگا۔ اور پھر یہی بولی رفتہ رفتہ اس مرتبے کو پہنچی جسے ہم ''اردو'' کہتے ہیں۔ ۳۱

اردو زبان کے اس نئے دور کے ساتھ ہی تاریخ نگاری کا بھی ایک نیا دور شروع ہوتا ہے کہ جس میں اردو نثر کی طرف توجہ زیادہ ہوگئی اور اسی دور میں اردو تاریخی تصانیف بھی سامنے آئیں۔ جس میں سب سے پہلا نام رستم علی بجنوری ۳۲ کی تصنیف قصہ احوال روھیلہ کا ہے۔ جو روہیلوں کی تاریخ پر مبنی ہے۔ اس میں رستم علی نے خود اپنے دیدہ وشنیدہ حالات براہ راست اردو میں قلم بند کئے اور یوں اردو نثر میں تاریخ کی اولین کتاب سامنے آئی۔ تاریخی ماخذ کی حیثیت سے یہ کتاب قابل مطالعہ ہے۔ اس میں بعض ایسی تصریحات ملتی ہیں جو کہیں اور قطعیت اور وضاحت کے ساتھ نہیں ملتیں۔ ۳۳ اس کتاب کے بعد اٹھارویں صدی میں چند اور تاریخی تصانیف سامنے آئیں جو یا تو اردو میں لکھی گئی تھیں یا ترجمہ کی گئیں تھیں۔ فارسی کی مشہور تاریخی تصانیف میں تاریخ فیروز شاہی ۳۴، تاریخ ہندوستان ۳۵، اور بہادر نامہ ۳۶، وغیرہ شامل ہیں۔ جو تقریباً اسی دور میں ترجمہ کی گئیں تھیں۔

اردو کو جب انگریزوں کی سرپرستی حاصل ہوئی تو اس کا ارتقا بھی تیز تر ہوگیا۔ اس دور کی خاص بات خود انگریزوں کا اردو زبان میں دلچسپی تھا اس کی وجوہات چاہے کچھ بھی ہوں بہر حال اتنا ضرور ہوا کہ وہ اپنے ہم زبانوں کو اردو زبان سے روشناس کرانے کے لئے ایک کالج کا باقاعدہ قیام عمل میں لے آئے۔ جو فورٹ ولیم کالج کے نام سے مشہور ہوا۔ ۳۷

اس کالج نے اردو کو ایک علمی زبان بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا، یہ انگریزوں کی مجبوری تھی جو اردو زبان کے ارتقاء کا سبب بن گئی۔ ۳۸ بہت جلد یہاں اردو تصنیف و تالیف کا محکمہ بھی قائم کر دیا گیا جس میں تراجم و تصانیف کا کام شروع ہوگیا۔ ان کتابوں کو چھاپنے کے لئے اردو ٹائپ کا مطبع بھی قائم کر دیا۔ یہی مطبع ہندوستان کا سب سے پہلا چھاپہ خانہ تھا۔ ۳۹ فورٹ ولیم کالج سے قابل ذکر کام، تراجم کے لئے کیا گیا جس کے لئے ہندو اور مسلم اہل علم حضرات کی خدمات حاصل کی گئیں۔ جن میں میر امن، حیدر بخش حیدری، شیر علی افسوس، مرزا علی لطف، میر بہادر علی حسینی، نہال چند لاہوری اور للولال جی کے علاوہ بہت سے صاحب علم وفن شامل تھے۔

ابوالفدا اسمٰعیل عربی کا ایک مشہور مورخ تھا اس کی فقہ اور جغرافیہ پر کئی تصانیف ہیں مگر اس کی ایک تصنیف کے بغیر قصہ تو ادھورا ہی رہے گا اس کی اصل شہرت یافتہ تصنیف کا نام المختصر فی الحوال البشر ہے مولوی کریم الدین نے اس کا ترجمہ کیا اور اس کا نام ریاض الاخبار رکھا۔ اس کتاب کا پایہ تحقیق نہایت بلند، اس کے اسناد قابل وثوق اور اس کی روایات قابل اعتبار ہیں۔ کریم الدین نے ترجمہ میں اس بات کا التزام رکھا ہے کہ ترجمہ با محاورہ، رواں اور سہل ہو۔ اس ترجمے کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تاریخیت کا مخصوص اسلوب بیدار ہو رہا تھا۔ زبان صاف اور فصیح ہو چکی تھی۔ ۴۰ اسی عہد سے اردو میں تاریخ نگاری کا رواج زور پکڑنے لگا اور عہد تراجم کا تو گویا خاتمہ ہوگیا۔ کیونکہ تقریباً اسی عہد سے سرسید احمد خان کا

عہد شروع ہوتا ہے۔ جو اپنی مخصوص اور امتیازی خصوصیات کی وجہ سے پچھلے دور سے ممتاز نظر آتا ہے۔

سرسید احمد خان:

سرسید احمد خان کے دور سے ہم اردو اور بطور خاص اردو فن تاریخ نویسی میں ایک اہم موڑ پاتے ہیں۔ یہ وہ دور ہے جس میں اردو تاریخ نویسی کے اصول وضوابط مقرر کئے گئے۔ اس دور کے اپنے مخصوص حالات تھے۔ جن کے اثرات مقامی تحریروں پر واضح طور پر مرتب ہو رہے تھے مثلاً مغلوں کا تیزی سے بڑھتا ہوا زوال اور انگریزوں کا مضبوط ہوتا ہوا اقتدار، مسلمانوں اور ہندوؤں میں احساس عدم تحفظ کو بڑھا رہا تھا۔ اس پر مستزاد ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی، اس جنگ آزادی کے صرف یہی نتائج سامنے نہیں آئے کہ مسلمان مفتوح ٹھہرے، بلکہ اس کے گہرے اور دوررس اثرات یہ ہوئے کہ مسلمان مجموعی طور پر حوصلہ ہار گئے۔ ان میں ترقی کرنے، آگے بڑھنے اور اپنی حیثیت تسلیم کروانے کی خواہش معدوم ہوگئی۔ ایسے نازک وقت میں سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء نے اپنی تحریروں کے ذریعہ مسلمانوں کا احساس کمتری کم کرنے، انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان پیدا ہو جانے والے شکوک شبہات دور کرنے اور آپس کے تعلقات بہتر بنانے کا عزم کیا۔ اس عزمِ نو نے اردو تاریخ نویسی پر بھی گہرے اثرات ڈالے اور یوں تاریخ نگاری کے جدید اصول وقوانین مرتب ہوئے اور نئی نئی باتیں شامل ہونے لگیں مثلاً سرسید احمد خان نے تاریخ نویسی میں فن تدوین کو رائج کیا۔ اس سے قبل اردو تاریخ نگاری میں فن تدوین کی کوئی مثال موجود نہ تھی۔ سرسید نے توزک جھانگیری، آئین اکبری اور تاریخ فیروز شاھی کی تدوین اور تصحیح کر کے اس فن کی ابتداء کی۔ یہ ابتدائی شکل تھی لہٰذا اس میں وہ معیار نظر نہیں آتا جو آگے چل کر ڈاکٹر حمید اللہ کی تدوین وتصحیح کے میدان میں نظر آتا ہے۔ بہرحال یہی دور تھا کہ جب تاریخی مقالہ نویسی کی بھی ابتداء ہوئی اور اب تاریخی تصانیف کی ضخامت کو نظر انداز کر کے تاریخ کو مختصر مقالات کی صورت میں پیش کیا جانے لگا۔ اور یہ وقت اور حالات کی اہم ضرورت تھی کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ موضوعات کا احاطہ کیا جاسکے اور دنیا تک اپنی آواز پہنچائی جاسکے۔ عربی میں مقالہ نگاری عام تھی ان مقالات کو ''رسالۃ'' کہا جاتا تھا۔ تاہم جہاں تک اردو زبان میں مقالہ نگاری کا تعلق ہے اس کا آغاز سرسید احمد خان نے کیا۔ عصری تاریخ نویسی، بطور خاص اردو میں، یہ بھی سرسید احمد کا کارنامہ ٹھہرتی ہے۔ اسباب بغاوت ھند، تاریخ سرکشی بجنور، ہنٹر کی کتاب پر ریویو، لائل محمڈن آف انڈیا اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

بطور مصنف سرسید کی نمایاں حیثیت مصلح مذہب کی ہے۔ خطبات احمدیہ، سیرت فریدیہ، اور ازدواج المطہرات وغیرہ کو اس کی مثال میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ سرسید احمد صلاحیتوں کے اعتبار سے تحقیق کے دلدادہ اور مورخ تھے۔ چنانچہ ان کی تاریخی تصانیف اس کا کافی ثبوت مہیا کرتی ہیں۔ [۱۴]

شبلی نعمانی:

سرسید احمد خان کے بعد شبلی نعمانی وہ قابل ذکر مورخ ہیں کہ جنہوں نے تاریخ نویسی میں ایک نیا فلسفہ متعارف کرایا۔

ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے تاریخ انسانی پر فلسفیانہ نظر ڈالی۔ انہوں نے مشرق ومغرب کے تاریخی سرمایہ پر جو تنقید کی ہے وہ بلاشبہ اصول تاریخ کے لئے فاضلانہ اور عالمانہ دستاویز کا حکم رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مغربی مورخین کے فلسفہ افکار اور مسلمان علمائے تاریخ سے بیک وقت استفادہ کیا اور ان سب معلومات کی بناء پر ایک نئے فلسفہ ءتاریخ کی بنیاد ڈالی۔

شبلی کے فلسفہ تاریخ کے مطابق فطرت کے واقعات نے انسان کے حالات میں جو تغیرات پیدا کئے ہیں اور انسان نے عالم فطرت پر جو اثر ڈالا ہے۔ ان دونوں کے مجموعے کا نام تاریخ ہے۔ تاریخ کا نصب العین ان واقعات وحالات کا پتہ چلانا ہے، جن سے یہ دریافت ہو کہ موجودہ زمانہ، گذشتہ زمانے سے بطور نتیجہ کیونکر پیدا ہوا۔[۴۲] فلسفیانہ نکتہ سنجی سے تاریخی نتائج نکالنے کے لئے شبلی نے دو وسائل اختیار کئے اول روایت اور دوم درایت۔[۴۳] وہ ابن خلدون کے منضبط کردہ اصول درایت سے متاثر تھے، مگر شبلی سے پہلے ان اصولوں کو کسی اور نے برتنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شبلی نعمانی نے نہ صرف ان اصولوں کی وضاحت کی، ان میں اضافے کئے بلکہ ان کو عملی جامہ پہنا کر مشرقی تاریخ نگاری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا، شبلی نے درایت کے اصول اور فن کے قاعدے بھی مقرر کر دیئے۔

شبلی کے اصول تاریخ نگاری کا ایک اصول یہ بھی تھا کہ وہ ایک خاص قسم کے طرز تحریر کے حامی تھے۔ ان کے نزدیک مورخ کا اصل فرض یہ ہے کہ وہ سادہ واقعہ نگاری کی حد سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ سرسید ضروری قرار دیتے تھے کہ تاریخ میں واقعات کے اسباب پر مکمل بحث کی جائے۔ تہذیب وتمدن کی تفصیلات شامل ہوں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سیاسی تاریخ کے ساتھ علمی وذہنی ترقیوں کا حال بھی درج ہو۔ شبلی کی تاریخ نگاری کے اصول بھی یہی تھے۔ اگر چہ شبلی کا فلسفہ تاریخ، سرسید کے مقابلے میں زیادہ مکمل اور ترقی یافتہ ہے

شبلی نے انسانی تہذیب وتمدن کی سرگزشت پر سرسید سے زیادہ زور دیا، یہاں تک کہ ان کے نزدیک کسی غیر قوم کا کسی غیر ملک پر قبضہ کرنا بھی جرم نہیں۔ بشرطیکہ اس قبضہ کے ذریعہ انسانی تہذیب وتمدن پر اچھا اثر پڑا ہو، ورنہ دنیا کے سب سے بڑے فاتح، سب سے بڑے مجرم قرار پائیں گے۔[۴۴] شبلی شاکی ہیں کہ فتوحات نویسی کے غلط رواج سے انسانی تہذیب و معاشرت کے بڑے قابل قدر آثار، دنیا سے معدوم ہو گئے ہیں اس لئے بھی، وہ بھی تہذیب انسانی کی سرگزشت کو لازمی سمجھتے تھے۔ کیونکہ تاریخ منقطع واقعات کا نام نہیں بلکہ ارتقائے تہذیب کی ایک مسلسل کہانی ہے۔ گویا اس معنی میں تاریخ، فلسفہ اجتماعی کی ایک شاخ قرار پائی۔

شبلی کی تاریخی تصانیف کی ایک طویل فہرست ہے۔ جس میں سے نہایت معروف کتابیں المامون، سیرت النعمان، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم اور سیرت النبی ﷺ ہیں۔ جو شبلی کے فلسفہ تاریخ اور اصول تاریخ کا بہترین نمونہ ہیں۔[۴۵] اور ایسی ہی تصانیف ثابت کرتی ہیں کہ شبلی اردو تاریخ نویسی میں پہلے ''فلسفی مورخ'' ہیں۔[۴۶]

سیرت النبی ﷺ شبلی نعمانی کی وہ تصنیف ہے جس میں بیک وقت محققانہ اور عاشقانہ دونوں رنگ پائے جاتے ہیں۔ جبکہ اصول تاریخ میں جذباتیت کا کوئی گزر نہیں۔ مگر شبلی نے ایک عاشق رسول امتی ہونے کے ناطے اس کتاب میں عاشقانہ

رنگ بھرا تو دوسری طرف ایک غیر جانبدار صاحب فن کے محققانہ انداز کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور یوں سیرت النبی ﷺ، اس ملاپ کے باوجود معرکۃ آرا قرار پائی۔ ۴۷ علامہ شبلی نعمانی صرف مورخ ہی نہ تھے بلکہ مورخ گر بھی تھے انہوں نے اپنی بے مثال صلاحیتوں سے کام لے کر تحقیقی و تاریخی کام کرنے والوں کی ایک ایسی جماعت پیدا کر دی تھی کہ جس نے آگے چل کر اپنی کاوشوں اور نگارشات سے اردو تاریخ نویسی کے دامن کو مالا مال کیا شبلی کی تربیت کردہ جماعت کے سرگروہ سید سلیمان ندوی تھے۔

سید سلیمان ندوی:

سید سلیمان ندوی، بیک وقت مورخ، محقق، ناقد، عالم دین، سیرت نگار اور سوانح نویس تھے۔ شبلی کی طرح سید سلیمان ندوی کو بھی تاریخ سے بڑا لگاؤ تھا، کوئی بھی مسئلہ ہو سید سلیمان اس کے موجود کو اس کے ماضی میں تلاش کئے اور پرکھے بغیر نہیں رہ سکتے تھے، اسی لئے ان کی تصانیف میں تاریخ کے حوالے ضرور ملیں گے۔ شبلی نے اپنی سوانح عمریوں کو وسعت دے کر تاریخ بنا دیا اور سید سلیمان بھی انہی کے نقش قدم پر چلے چنانچہ آپ کی تحریر کردہ سوانح عمریاں، سیرت عائشہ ۴۸، حیات مالک ۴۹، خیام ۵۰ اور حیات شبلی ۵۱ صرف سوانح کی کتابیں نہیں بلکہ اپنے دور کے رجحانات اور ماقبل کی تاریخ کے واقعات کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ دیگر کتب سے قطع نظر حیات شبلی صرف شبلی کی سوانح نہیں بلکہ ہندوستان میں اسلام اور اس کے فکری رجحان کی سو سالہ علمی و مذہبی تاریخ بھی ہے۔ ابوالحسن علی ندوی رقمطراز ہیں:

> ''حیات شبلی دیکھنے میں ایک نامور عالم کی شخصی سوانح ہے، مگر حقیقتاً مسلمانوں کی ایک صدی علمی، دینی، تہذیبی اور فکری ارتقا کی تاریخ ہے، جس کے بغیر مسلمانوں کے قوی مزاج اور موجودہ دور کو سمجھنا مشکل ہے۔ اس میں تقریباً تمام معاصر تحریکات اور اداروں کی سرگزشت بھی آ گئی ہے۔'' ۵۲

سید سلیمان ندوی ایک کامیاب مورخ ہیں کیونکہ وہ تاریخ نگاری میں اسلوب کے بجائے، امر واقع کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ ان کی کتب میں ایسے مواقع کم ہی آئے ہیں کہ جہاں ان کے ہاتھ سے حقیقت نگاری کا دامن چھوٹ گیا ہو۔ تاریخ جس غیر جانبداری اور صداقت کی متقاضی ہے وہ سید سلیمان میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ ان کا اسلوب تاریخ نویسی کے مزاج کے مطابق تھا۔ الفاظ کا استعمال نہایت احتیاط کے ساتھ کرتے اور بیان، تشبیہات اور استعارات سے مبرا ہوتا تھا۔ ندوی صاحب کی تصانیف میں چند بلاشبہ تاریخ نگاری کا شاہکار ہیں۔ مثلاً سیرت النبی ۵۳، ارض القرآن ۵۴، عربوں کی جہاز رانی ۵۵ اور خطبات مدارس ۵۶ وغیرہ۔

اپنی تحقیقات اور تخلیقات کے علاوہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ندوۃ المصنفین اور پیروکاران شبلی کو تحقیقی کاموں میں مصروف اور متحرک رکھا۔ اس ادارے سے ایسے ایسے اہل قلم پیدا ہوئے جنہوں نے شبلی کے مشن کو جاری رکھا۔ دارالمصنفین سے وہ کتابیں برابر شائع ہوتی رہیں جو مسلمانوں کو علمی و تمدنی تاریخ کے اوراق ان کی نگاہوں کے سامنے رکھتی ہیں۔ اور نئی نسل کی تعلیم اور ان کی تاریخی شخصیت کی تعمیر کا ذریعہ ہیں۔ دارالمصنفین کی مطبوعات کا تجزیہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ

ایک بار پھر سیرت وسوانح میں مرکزی اہمیت رسالت اور خلافت راشدہ کو حاصل ہونے لگی۔ یہ ایک بڑا اہم رجحان تھا، اس سے قبل جیسا کہ پہلے بھی تذکرہ کیا گیا کہ شبلی کی تصانیف میں اہمیت عباسی دور کو حاصل رہی تھی۔ اس کے علاوہ بھی اسلامی لٹریچر میں تہذیب اور تمدن میں دلچسپی بڑھ رہی تھی گو کہ عباسی دور علمی اور ثقافتی لحاظ سے بڑا زرخیز تھا۔ مگر اسلام کا مثالی دور بہرحال نہ تھا۔ دارالمصنفین اور سید سلیمان ندوی نے مطالعہ کا محور ایک بار پھر اسلام کے مثالی دور کی طرف پھیر دیا۔ اور یہ وقت کے پیدا شدہ رجحانات کا مطالبہ بھی تھا۔

سید سلیمان ندوی کے رفقاء یا دبستان شبلی میں، اور اس دوبارہ پلٹ آنے والے رجحان پر سب سے زیادہ کام کرنے والے لوگوں میں مولانا عبدالسلام ندوی، شاہ معین الدین ندوی، مولوی سعید انصاری، عبدالماجد دریا آبادی، سید ریاست علی ندوی، مولانا ابوالحسنات ندوی، سید نجیب اشرف ندوی، مولانا ابوظفر ندوی، مولانا حافظ مجیب اللہ ندوی، ڈاکٹر محمد عزیر اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن وغیرہ جیسے اہل قلم شامل ہیں۔ ۵۷

دارالمصنفین (یا دبستان شبلی) نے تاریخ نویسی کے باب میں جو خدمات انجام دیں ہیں، اس کو مختصراً اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ

☆ دارالمصنفین نے عہد رسالت وخلافت راشدہ کے خدوخال کو اجاگر کیا۔

☆ مسلمانوں کی فکری تاریخ کے سلسلے کو آگے بڑھایا، مزید اس میں فقہ، قضاۃ، تصوف، تفسیر اور فلسفہ پر کام ہوا۔

☆ ادبی تنقید کی روایت جس کی داغ بیل شبلی ڈال گئے تھے اسکو بھی زندہ رکھا گیا، اس سلسلہ میں عمر خیام، اقبال کامل، شعرالہند، اور گل رعنا کی اشاعت قابل ذکر ہے۔

☆ مغربی فکر سے اردو دان طبقہ اور خصوصیت سے علماء کو روشناس کرانے کی نئی روایت قائم کی گئی، ذہنی بیداری کے لئے مغربی مفکرین کی اہم تصنیفات کے تراجم کئے گئے۔ یہ سلسلہ بڑا مفید تھا مگر اس میں زیادہ اہمیت اٹھارویں اور انیسویں صدی کے فلسفیانہ مکاتب فکر کو دی گئی۔ سائنسی فکر اور زمانہ قریب کے مفکرین کی طرف خاص توجہ نہ کی گئی۔

دارمصنفین کے کام میں غالب پہلو تاریخیت تھا، چنانچہ دینی احیاء کے اس دور میں عہد رسالت اور خلافت راشدہ کو مرکز توجہ بنانے میں بیش قیمت خدمات انجام دی گئیں۔ یہ اسی کام کا نتیجہ تھا کہ اسلامی تاریخ ایک مستقل مضمون کی حیثیت سے ابھری اور پاک وہند کی جامعات میں اس نے اپنا مقام بنالیا۔ ۵۸

دبستان شبلی کا یہ کارنامہ بھی کچھ کم اہم نہیں کہ اس نے تاریخ وتمدن کے مطالعہ کو نہایت سلیقے کے ساتھ انجام دیا۔ تاریخ و تمدن پر اس کام نے فکر اور جذبہ دونوں کو متاثر کیا، ماضی پر اعتماد کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ اسلام نے جو کارنامہ اپنے پہلے دور میں انجام دیا تھا، کیا ویسا ہی کارنامہ ہر دور میں انجام دے سکتا ہے۔ لیکن یہ اہم سوال ابھی تک حل طلب تھا کہ کس طرح؟

ڈاکٹر ظفر اقبال دارالمصنفین کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"(دارالمصنفین کی سنہری خدمات کے بعد) اسلام کی تاریخیت پر اعتماد و یقین پیدا ہو گیا تھا، مگر فوری مسائل

سے اس کی مناسبت ابھی واضح نہ ہوئی تھی، یہ لٹریچر وہ انقلابیت پیدا نہ کر سکا جو قوموں کو سر دھڑ کی بازی لگانے کے لئے ابھارتی ہے۔ ماضی کی تابناکی کے قصے، حال کی زبوں حالی کا مداوا نہیں ہو سکتے۔ اس کے لئے ایسے ادب کی ضرورت تھی جو حال کے مسائل کو اپنی گرفت میں لے اور ان کے حل کے لئے وہ لائحہ عمل پیش کرے جس کی توجہ کا اصل مقصد حال اور مستقبل ہو۔ تاریخیت کی روایت جس مقام تک لے آئی تھی، اس کا مطالبہ تھا کہ اب اسلام کے نظریاتی موقف کو حال کی زبان سے ادا کیا جائے۔''۵۹

دبستان شبلی کے مورخین احیائے اسلام کے اس دور میں تاریخ اسلام اور سیرت کے متعلق محتاط رویہ رکھتے تھے۔ انہوں نے معرکۃ الآراء تصانیف تحریر کی اور تاریخ نگاری کے جدید مزاج کے مطابق اسلوب تحریر اختیار کیا۔

اس نئے رجحان کے اثرات تمام ملک میں نظر آئے اور ایک تحریک کی صورت میں ایسی تاریخی تحریریں نظر آنے لگیں جو موجودہ زمانے کی ضروریات کو پورا کرتی تھیں، اور بطور خاص برصغیر میں انگریزوں کے زیر اثر مستشرقین کے بڑھتے ہوئے اثرات کو زائل کرنے کی طرف مائل تھیں اور ایسے نامور علماء اور مورخین سامنے آئے جنھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ اسلام کے نظریاتی موقف کو حال کی زبان سے ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ یہ وقت کی ضرورت بھی تھی اور مسلمانوں کے فن تاریخ نویسی کو زندہ رکھنے کی بھرپور کوشش بھی تھی۔

حواشی وحوالہ جات:

۱۔ ایچ۔ ایچ ڈوڈیل، انڈیا (لندن: ۱۹۳۶ء)، جلد ۱، ص ۲۲-۲۳۔

۲۔ ظفر اقبال، اردو میں تاریخ نویسی، (کراچی: ۲۰۰۴) ص ۶۵۔

۳۔ معراج محمد، سلطنت دھلی میں تاریخ نویسی کا آغاز، مشمولہ ماہنامہ معارف، (اعظم گڑھ، انڈیا، جولائی ۱۹۹۵ء) ص ۲۸-۲۹۔

۴۔ ایضاً، ص ۲۹۔

۵۔ فارسی زبان میں عربی طرز کی تاریخ نویسی کی بنیاد سامانیوں کے عہد میں وسط ایشیاء میں پڑ چکی تھی، جبکہ ابوعلی البلعمی نے ۳۵۲ھ میں تاریخ طبری کا خلاصہ اور ترجمہ فارسی زبان میں کیا۔ (تاریخ طبری فارسی، مطبوعہ لکھنو، ۱۲۹۱ھ)

۶۔ البیرونی: برہان الحق، ابوالریحان محمد ابن احمد البیرونی، ۳ ذی الحجہ ۳۶۲ھ میں خوارزم کے ایک گمنام گھرانے میں پیدا ہوئے، السمعانی نے اپنی کتاب الانساب میں اس کے نام 'البیرونی' کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ اس کی سکونت شہر کے بیرونی حصے میں تھی اس لئے البیرونی مشہور ہو گیا۔ اس کی زندگی کے ابتدائی پینتالیس سال سیاسی طور پر بڑے ہنگامہ خیز گزرے، اس دوران اسے جلاوطن بھی ہونا پڑا اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ البتہ جب وہ محمود غزنوی کے ساتھ غزنہ

پہنچا تو اس کی عملی زندگی کا زریں دور شروع ہوا۔ البیرونی کے اپنی زندگی کے غالباً بارہ تیرہ سال شاہی نگرانی میں ہندوستان میں گزارے، اسی اثناء میں یہاں اس نے سنسکرت بھی سیکھی اور ہندو مذہب، تہذیب وتمدن، رسم ورواج عادات وتوہمات کا مطالعہ کیا۔ اس نے ۴۲۱ھ میں اپنی شہرہ آفاق کتاب تحقیق ماللھند تحریر کی۔ البیرونی کی تالیفات کی تعداد ۱۷۵ کے قریب ہے۔ البیرونی بیک وقت سیاح، ریاضی دان، ماہر فلکیات، جغرافیہ دان، مورخ، معدنیات، طبقات الارض اور خواص الادویہ کا ماہر اور آثار قدیمہ کا عالم تھا۔ کئی زبانوں کا ماہر تھا۔ عربی اور فارسی کے علاوہ سنسکرت، یونانی، سریانی اور عبرانی زبانوں پر مہارت رکھتا تھا۔ رجب ۴۴۰ھ میں وفات پائی۔ (دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۵، ص ۲۶۱ تا ۲۷۱)

۷ ابوریحان البیرونی، کتاب تحقیق ما للھند (حیدرآباد دکن: ۱۹۵۸ء)

۸ ابو النصر محمد العتبی، عربی زبان کے مشہور مورخ گزرے ہیں، ان کی کتابوں کے فارسی زبان میں ترجمے ہوئے جو ان کی تصانیف کی مقبولیت کو ظاہر کرتی ہیں گو کہ ان کا پایہ استناد اتنا قابل اعتبار نہیں کیونکہ ان کی تصانیف میں سنین کی غلطیاں ڈھونڈی جاسکتی ہیں۔

۹ ابو النصر محمد تعمی، تاریخ یمینی (لاہور: مطبع محمدی، ۱۳۰۰ھ)۔

۱۰ ابو الفضل محمد بن الحسین کاتب البیہقی، پانچویں صدی ہجری کے نصف اول کا مشہور ایرانی مورخ ہے، موجودہ خراسان کے گاؤں حارث آباد میں پیدا ہوا۔ جوانی میں تحصیل علم کے لئے نیشاپور گیا جو اس دور میں ایران کے عظیم ترین علمی مراکز میں سے ایک تھا، تھوڑی ہی مدت بعد اسے غزنویوں کے دربار میں باریابی ہوئی اور اس کی زندگی کا بیشتر حصہ اسی ماحول میں گزرا وہ ان کے اہم دبیروں (یعنی کاتبوں) میں تھا۔ اس کا انتقال صفر ۴۷۰ھ بمطابق اگست ۱۰۷۷ء میں ہوا۔ ابو الفضل البیہقی فارسی زبان کا سب سے اہم مورخ سمجھا جاتا ہے۔ اس نے اپنے زمانے کے واقعات کو، جنہیں اس نے بہت قریب سے دیکھا تھا، انتہائی سچائی، حق گوئی اور دیانت کے ساتھ فصیح ادبی زبان میں پیش کیا ہے اور معتبر اسناد اپنی کتاب میں درج کی ہیں۔ اس کی سب سے اہم تاریخی تصنیف جو تیس ۳۰ جلدوں پر مشتمل تھی اور جسے مختلف نام دئے گئے ہیں، اس کے محض چند حصے تاریخ بیہقی کے نام سے دستیاب ہیں زیادہ بڑا حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے اردو دائرہ معارف اسلامیہ، بار ثانی، جلد ۵، ص ۳۱۴ تا ۳۱۶)۔

۱۱ معراج محمد، ص ۳۲، ۳۳۔

۱۲ معراج محمد، ص ۲۸۔

۱۳ نور الدین محمد بن محمد بن یحییٰ بن طاہر بن عثمان العوفی چھٹی صدی عیسوی کے اواخر اور ساتویں صدی عیسوی کے ابتدائی زمانے کا ایک مورخ، جس کا سلسلہ نسب صحابی رسول حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے ملتا ہے اور اسی نسبت سے وہ عوفی کہلائے۔ محمد قاسم فرشتہ اپنی تاریخ میں ان کی جائے پیدائش بخارا بتاتا ہے۔ عوفی بخارا سے ماوراء النہر گیا اور پھر وہاں سے ہجرت کرتا ہوا سندھ پہنچا، یہاں اس وقت ناصر الدین قباچہ کی حکمرانی تھی، جس کی فرمائش پر اس نے اپنی مذکورہ تصنیف لکھنی شروع کی اور نظام الملک جنیدی کے دور میں مکمل کی۔

۱۴ نورالدین عوفی، منتخب جوامع الحکایات و لوامع الروایات (بخش نخست، بنگاہ علمی، ۱۳۴۴)، مقدمہ: محمد تقی بہار۔

۱۵ جوزجانی کا اصل نام ابوعمر منہاج الدین عثمان تھا، معروف مولانا منہاج سراج سے ہوئے۔ Raverty اور دیگر مولفین ان کو جرجانی لکھتے ہیں، جو غلط ہے۔ شخصیت کے اعتبار سے منہاج السرانی ایک علم، فقیہ، شاعر و ادیب اور مورخ تھے۔ جوزجانی کی مشہور کتاب طبقاتِ ناصری ہے جس میں اس نے فارس، عرب اور یمن کے قدیم بادشاہوں اور انبیاء کرام کے حالات اور پھر ظہور اسلام سے لے کر اپنے وقت تک کی تاریخ بیان کی ہے۔ تاہم اس کا اسلوب بیان اور واقعات کے اخذ کو، تاریخ کا اسلوب قرار نہیں دیا جا سکتا اس کی ایک بڑی وجہ اس کی تاریخ نگاری میں قصیدہ خوانی کے رنگ کا موجود ہونا ہے۔ آخری زمانے میں وہ قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز رہا، تاہم اس کی تاریخ وفات کا علم نہیں۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۷، ص ۵۰۷)

۱۶ امیر خسرو کا اصل نام ابوالحسن یمین الدین تھا۔ ۶۵۱ھ میں قصبہ مومن آباد یوپی میں پیدا ہوئے۔ ترکی، ہندی، فارسی، اور عربی زبان جانتے تھے۔ دربار سے وابستہ رہے۔ البتہ خاص و عام میں شہرت اس وقت ملی جب انہوں نے منگولوں کے ہاتھوں شہید ہو جانے والے شہزادے کا مرثیہ لکھا۔ اس مرثیہ نے گلی کوچوں میں پہنچ کر ان کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے اور یوں دربار میں بھی ان کی اہمیت بڑھ گئی۔ وہ یکے بعد دیگرے چھ سلاطین کے دربار سے منسلک رہے اور ان سلاطین کی فرمائش پر تاریخی مثنویاں تحریر کیں۔ اس کے علاوہ بھی ان کی کئی تحریریں ہیں مگر وہ دست برد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ ۱۸ رشوال ۷۲۵ھ کو انتقال ہوا، ان کا مدفن دہلی میں ہے۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۸، ص ۹۳۱ تا ۹۳۳)

۱۷ صدیقی، علی محسن، ''امیر خسرو کی تاریخی مثنویاں'' در مضامین تاریخی (کراچی: قرطاس، فروری ۲۰۰۶)، ص ۲۱۵ تا ۲۳۵۔

۱۸ مضامین تاریخی، ص ۲۱۰۔

۱۹ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۶، ص ۴۷۔

۲۰ گلبدن بیگم شہنشاہ بابر کی بیٹی، ہمایوں کی سوتیلی بہن اور اکبر کی پھوپھی تھیں۔ ان کی والدہ صالحہ سلطان فرمانروائے سمرقند (سلطان محمود مرزا) کی بیٹی تھیں، ان کی ولادت ۱۵۲۲ء میں کابل میں ہوئی، جب بابر نے ہندوستان فتح کر لیا تو ۱۵۲۹ء میں وہ بابر کے پاس ہندوستان پہنچ گئیں۔ اس کی شادی خضر خواجہ خان سے ہوئی جو ایک زمانے میں پنجاب کا صوبیدار رہا تھا۔ جب ہمایوں ہندوستان سے نکلا تو وہ اس کے ساتھ ایران نہیں گئی بلکہ افغانستان ہی میں رہی۔ وہ دوبارہ ہندوستان اکبر کے عہد حکومت کے دوسرے سال یعنی ۱۵۵۷ء میں آئی، جہاں سے وہ شاہی خاندان کی چند خواتین کے ساتھ حج کے لئے مکہ معظمہ گئی۔ واپسی کے سفر میں عدن کے قریب ان کا جہاز تباہ ہو گیا اور وہ ۱۵۸۲ء سے قبل ہندوستان واپس نہ آ سکیں۔ ۷ ارمئی ۱۶۰۳ء میں ۸۲ سال کی عمر میں آگرے میں انتقال پا گئیں۔ شاہی خاندان میں ان کا بڑا احترام تھا۔ اکبر نے ان کا جنازہ خود اپنے کاندھوں پر اٹھایا تھا۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۱۷، ص ۴-۵۵۳ مقالہ ''گلبدن بیگم'' مقالہ نگار H. Bevertoge)

۲۱ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۱۷، ص ۵۵۴۔

۲۲ شیخ ابوالفضل علامی اپنے زمانے کے مشہور عالم شیخ مبارک ناگوری کا دوسرا بیٹا اور شیخ فیضی کا چھوٹا بھائی تھا۔ ۱۴ر جنوری ۱۵۵۱ء کو آگرہ میں پیدا ہوا، ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ ۱۵۷۴ء میں اپنے بھائی فیضی کی وساطت سے دربار اکبری تک رسائی ہوئی ابتداء میں اسے منشی گری کی خدمت سپرد ہوئی لیکن رفتہ رفتہ ترقی کرتا ہوا صدر الصدور کے منصب تک پہنچ گیا۔ اکبر کے مذہبی عقائد میں ابوالفضل کا اچھا خاصا دخل مانا جاتا ہے۔ ابوالفضل فارسی کا ایک بلند پایہ اسلوب و انشاء پرداز مانا جاتا تھا۔ اس کی اہم تاریخی تصانیف اکبر نامہ اور آئین اکبری ہیں۔ (دیگر تصانیف کے لئے دیکھئے، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، بار ثانی، جلد ا، ص ۹۱۔۸۹)

۲۳ علامہ ابوالفضل، آئین اکبری، مترجم مولوی محمد فدا (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء)

۲۴ پی۔ ہارڈی، مقالہ ''فرشتہ'' در دائرہ معارف اسلامیہ (طبع اول ۱۹۷۵ء) جلد ۱۵، ص ۲۶۷۔

۲۵ عبدالقادر بدایونی: عہد اکبری کا مشہور عالم اور مورخ، ہندوستان کی قدیم ریاست جے پور میں ۹۴۷ھ/۱۵۴۰ء میں پیدا ہوا۔ ۹۸۱ھ میں تقریباً چونتیس سال کی عمر میں شہنشاہ اکبر کے دربار سے وابستہ ہوا۔ اسی زمانے میں ابوالفضل کو بھی دربار اکبری میں جگہ ملی، جس کے سامنے بدایونی کی نہ چل سکی اور کچھ عرصے بعد اسے دربار سے علیحدہ ہونا پڑا۔ تاہم جب تک وہ اکبری دربار سے وابستہ رہا، اکبر بدایونی سے علمی خدمات لیتا رہا۔

۲۶ فرشتہ: نام محمد قاسم تھا، ریاست بیجاپور اور احمد نگر کا مشہور درباری، مسلمان مورخ اور طبی مصنف تھا۔ اس نے ایک پر آشوب سیاسی زندگی گزاری، فرشتہ کی شہرت اس کی مشہور تاریخ گلشن ابراهیمی پر مبنی ہے، جس کے دو نسخے ملتے ہیں۔ ایک نسخہ ۱۶۰۷۔۱۶۰۶ء کا لکھا ہوا ہے۔ دوسرے کا نام تاریخ نورس نامہ'' ہے اور اس پر سنہ ۱۰۔۱۶۰۹ تحریر ہے۔ گلشن ابراہیمی کا آغاز شاہان اسلام کے واقعات اور مشائخ عظام کے سوانح سے ہوا ہے۔ جن کا تعلق سلطان سبکتگین غزنوی کے زمانے سے کسی نہ کسی صورت میں ممالک ہندوستان سے رہا ہے، واقعات سے پہلے ایک مقدمہ ہے جس میں ہندوؤں کی تاریخ کا خلاصہ آگیا ہے۔ کتاب کے خاتمے پر ہندوستان کے جغرافیہ، ہندوؤں کی تاریخ شناسی اور ان ہندو راجاؤں کا ذکر ہے جو فرشتہ کے زمانے میں باجگزار حکمران تھے۔

۲۷ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۴، ص ۱۴۴، مادہ 'بداونی'۔

۲۸ ایضاً، جلد ۱۵، ص ۲۷۰۔

۲۹ ابوالفضل نے اپنی تصنیف آئینِ اکبری میں اس زبان کو اسی نام سے منسوب کیا ہے۔

۳۰ ریختہ کے معنی ملی جلی زبان کے لئے جاتے ہیں، ریختہ کو ترقی دینے والوں میں امیر خسرو کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ جنہوں نے فارسی، ہندی باہم ملا کر شاعری کی۔ یہ شعر اس کی عمدہ مثال ہے۔

زحال مسکین مکن تغافل ورائے نیناں بنائے بتیاں
چو تاب ہجراں نہ دارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

کچھ زمانہ گزرنے کے بعد ریختہ صرف موسیقی کی اصطلاح نہ رہی بلکہ دو زبانوں کی آمیزش والا ہر منظوم کلام ریختہ کہلانے

لگا۔ مگر اس وقت اس سے مراد زبان نہیں لی جاتی تھی۔ آگے چل کر اس کا اثر، نثر اور پھر زبان پر ہونے لگا۔ ابتدا یہ مختلف ناموں سے پکاری جاتی رہی، مثلاً شیخ باحق کے نزدیک یہ زبان دہلوی ہے۔ اسی زبان کو اہل گجرات، گجراتی کہتے اور اہل دکن، دکنی، یہی زبان گوجری بھی کہلائی، بالآخر یہ اردو کے موجودہ نام سے پکاری گئی۔

۳۱ شہنشاہ عالمگیر کے عہد سے قبل اردو کا نام کسی زبان کی حیثیت سے کسی تحریر میں نظر نہیں آتا۔

۳۲ رستم علی بجنوری نے یہ کتاب دارانگر انگریزی چھاؤنی میں ملازمت کے درمیان ایک انگریز افسر جان پارلس فورڈ کی فرمائش پر (۱۱۹۰ھ) کے لگ بھگ لکھی۔

۳۳ نجم السلام، سید رستم علی بجنوری، قصہ احوال روھیلہ، مشمولہ نقوش، شمارہ ۵۶، ص ۱۶۲۔

۳۴ تاریخ فیروز شاھی، اس نام سے فارسی میں دو تاریخیں لکھی گئیں ہیں ایک شمس سراج عفیف کی اور دوسری ضیاء الدین برنی کی اول الذکر کتاب میں فیروز شاہ کے خاندان اور خانگی حالات پر زیادہ زور دیا گیا ہے جبکہ ضیاء الدین نے اس عہد کے حالات و واقعات اور دکان کا بھی کافی تذکرہ کیا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ وارث علی بن شیخ بہادر نے کیا ہے۔

۳۵ تاریخ ہندوستان ایک ضخیم تاریخ ہے، جو کہ فرزند علی حسینی کی فارسی تصنیف ملخص التواریخ کا ترجمہ ہے۔ (۱۱۵۳ھ) مترجم (جن کا نام معلوم نہیں ہوسکا) نے ترجمہ کرتے وقت اپنے زمانے تک کہ حالات کا اضافہ کر دیا ہے۔ یوں اردو ترجمہ میں امیر تیمور کے زمانے سے ٹیپو سلطان کی انگریزوں کی جنگ ۱۱۹۴ھ تک کے واقعات شامل ہو گئے ہیں۔ یہ تاریخ نامکمل ہے اس کا واحد نسخہ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہے جو نامکمل ہے۔ (ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، اردو نثر کا آغاز و ارتقاء، کراچی، ۱۹۷۸ء، ص ۴۲۶)۔

۳۶ بہادر نامہ دراصل میسور کی تاریخ ہے جو کرشنا راجہ سے شروع ہو کر ٹیپو سلطان کی وفات ۱۲۱۳ھ پر ختم ہوتی ہے۔ فارسی تاریخ میں ۲۴ ابواب ہیں جبکہ اردو ترجمہ میں صرف ۲۲ ابواب ہیں، افسوس مصنف اور مترجم کا نام کہیں درج نہیں (اردو نثر کا آغاز و ارتقاء، ص ۴۲۸)

۳۷ کالج کا قیام ۴ مئی ۱۸۰۰ء کو عمل میں آیا یہ زباندانی کا کالج تھا۔ جس کے پہلے پرنسپل گلکرائسٹ تھے اور یہ اس وقت کے گورنر جنرل لارڈ ولزلی کی کوششوں کا ثمرہ تھا۔

۳۸ ڈاکٹر حمید اللہ اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ انگریزوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی و ادبی اور روزمرہ بول چال کی زبان کا زور توڑنے کے لئے اردو کے ارتقاء پر زور دیا۔ جس سے ان کا منشا یہ بھی تھا کہ چونکہ اردو میں مذہبی کتابیں نہیں ہیں۔ لہذا مسلمانوں کو جلد ہی عیسائیت کی طرف راغب کیا جا سکے گا۔

۳۹ حامد حسن قادری، داستان تاریخ اردو، (آگرہ: ۱۹۵۷ء) ص ۸۲۔

۴۰ ظفر اقبال، اردو میں تاریخ نویسی، ص ۷۹۔

۴۱ تفصیلات کے لئے دیکھئے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، احمد خان، سر سید، مشمولہ دائرہ معارف اسلامیہ، طبع اول، جلد ۲، ص ۱۱۶ تا ۱۲۲، نیز اردو میں تاریخ نویسی ص ۸۲، ۸۸۔

۴۲ نعمانی،شبلی،الفاروق، جلداول ص ۴۸۔

۴۳ روایت سے شبلی کی مراد یہ ہے کہ واقعہ،متعلقہ شخص کی وساطت سے بیان کیا جائے اور پھر اس سے لے کر آخر راوی تک روایت کا سلسلہ متصل بیان کیا جائے۔جبکہ درایت سے ان کی مراد یہ ہے کہ عقلی اصولوں سے واقعہ کی تنقید کی جائے۔

۴۴ نعمانی،شبلی،مقالات شبلی،جلد۶،ص۱۹۴۔

۴۵ تفصیلات کے لئے دیکھئے،اردو میں تاریخ نویسی،ص۶۴ومابعد۔

۴۶ ایضاً،ص۱۶۴

۴۷ نعمانی،شبلی،سیرۃالنبی (اسلام آباد:نیشنل بک فاؤنڈیشن،۱۹۵۳ء)

۴۸ ندوی،سیدسلیمان،سیرۃ عائشہ(اعظم گڑھ:دارالمصنفین،۱۹۲۰ء)

۴۹ ایضاً،حیات مالک (اشاعت ثانی،اعظم گڑھ:دارالمصنفین، ۱۹۲۱ء)اس کتاب کوامام مالک کے حیات وآثار پر اردو میں پہلی کتاب ہونے کا شرف حاصل ہے۔

۵۰ ایضاً،خیام (اعظم گڑھ:دارالمصنفین،۱۹۳۲ء) آل انڈیااورینٹل کانفرنس منعقدہ دسمبر۱۹۳۰ء میں پیش کیا جانے والا مقالہ جوبعدازاں کتابی صورت میں شائع ہوا۔

۵۱ ایضاً،حیات شبلی (اعظم گڑھ:دارالمصنفین،۱۹۴۳ء)

۵۲ روزنامہ قومی اخبار،لکھنو ،(۳۰نومبر۱۹۵۳ء)

۵۳ سیرۃ النبی کی ابتداعلامہ شبلی نعمانی نے کی،تاہم وہ دوجلدوں سے زائدتحریرنہ کرسکےاورخالق حقیقی سے جاملے۔ان کے شاگردعزیزسیدسلیمان ندوی نے ان کی خواہش کے مطابق باقی کی جلدیں مرتب کیں۔اس کتاب کی کل چھ جلدیں ہیں۔

۵۴ ندوی،سیدسلیمان،ارض القرآن (اس کتاب کی پہلی جلد،مطبع شاہی لکھنوسے۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی جبکہ دوسری جلد اس کے تقریباتین سال بعد۱۹۱۸ء میں معارف پریس اعظم گڑھ سے منظرعام پرآئی۔)

۵۵ ندوی،سیدسلیمان، عربوں کی جہاز رانی (اعظم گڑھ:دارالمصنفین،تاریخ ندارد) ڈاکٹرحمیداللہ نے ایسی کتاب پراپنا استدراک لکھاتھاجو ماہنامہ معارف سے چارقسطوں میں شائع ہوا۔

۵۶ ندوی،سیدسلیمان،خطبات مدارس (آٹھ خطبات کا مجموعہ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا)

۵۷ اردو میں تاریخ نویسی،ص۲۱۶۔

۵۸ ایضاً،ص۲۱۷۔

۵۹ ایضاً،ص۲۱۷۔